فہمِ اسلام کے جدید خطوط

مصنف: ڈاکٹر محسن نقوی

تعارف: عبد الباسط پیتافی

فہمِ اسلام
کے
جدید خطوط
ڈاکٹر محسن نقوی

کسی کتاب کے مطالعہ سے اگر آپ کی قائم شدہ دنیائے اعتقادات و تصورات میں بھونچال آجائے یا پھر آپ کے دل و دماغ میں نئے سوالات ابھر کر آپ کو اضطراب میں مبتلا کر دیں تو اس کتاب سے اختلاف تو ممکن ہے مگر اس کی قدر، عظمت اور اہمیت سے مفر نہیں کیا جاسکتا۔

آج جس کتاب کا تعارف مقصود ہے وہ بھی اسی قبیل سے ہے جس کا نام ہے " **فہمِ اسلام کے جدید خطوط** " ہے۔

اس کتاب کے کل دس ابواب ہیں مگر ان کے عمومی و سرسری تعارف سے قبل ہم کتاب کے موضوع اور مرکزی نکتہ کو سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر محسن نقوی لکھتے ہیں:

"یہ (کتاب) عہدِ جدید میں اسلام کے لیے نئی بنیاد فراہم کرنے کی ایک کوشش ہے۔" (ص12)

اس کے ساتھ ان کا ایک دوسرا جملہ ملاحظہ فرمائیں:

"خاص کر اصول فقہ جو اس کتاب کا موضوعِ بحث و تحقیق ہے۔" (ص62)

ان دونوں جملوں میں سے پہلا جملہ پڑھتے ہی آپ چونکے ہوں گے کہ یہ تو واقعی عمدہ سعی ہے لیکن جونہی دوسرا جملہ پڑھا ہوگا تو آپ کو تعجب ہوا ہوگا کہ ان دونوں میں ربط کیا ہے؟

درحقیقت راقم نے خود ہی ان بظاہر دو اجنبی جملوں کا انتخاب کیا ہے تاکہ کتاب کی گہرائی و گیرائی پر بات کی جاسکے جو کتاب کے مصنف کا منشا ہے۔

اس کتاب کا موضوع کیا ہے؟

درج بالا دو جملوں کو سمجھنے کے لیے ہم پہلے بطورِ تمہید یہ واضح کر دیں کہ اسلام میں مختلف علماء، مجتہدین، فقہاء اور مفکرین پیدا ہوتے رہے ہیں اور یوں مختلف شعبوں میں علم پروان چڑھتا اور الگ الگ کروٹیں لیتا رہا ہے اور ان علوم میں سے سب سے زیادہ عملی وابستگی علم فقہ ہی سے رہتی ہے اور معاشرہ ان فقہاء اور فقہی تراث کو اسلام کے احکام و شریعت سمجھ کر قبول کرتا اور انہی سے اپنے مسائل کا حل بھی چاہتا ہے۔

اور ہم جانتے ہیں کہ اس علم کی بنیادیں یا ان کے اصولوں پر بات اصول فقہ کے شعبہ میں ہوتی ہے۔

اس پہلو کے ساتھ دوسرا پہلو یہ یاد رکھنے کا ہے کہ جب زمانے نے خود کو بدلا اور جدید زمانے میں نئے سوالات اور چیلنجز آئے تو بعض اہل علم کے یہاں خلش پیدا ہوئی کہ کیا اسلام کی یہ فقہی تراث یا اس کے بیان کردہ احکام آج کے معاشرہ سے بھی متعلق ہیں؟ کیا وہ اسلام جو آفاقی اور قیامت تک رہنے والوں کے لیے آیا ہے اس کے ان احکامات میں اتنی سکت ہے کہ وہ جدید معاشرے سے متعلق ہو سکیں اور جدید اذہان کو مطمئن کر سکیں؟

علامہ اقبال کے عہد تک یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ یہ فقہی تراث قابل قبول نہیں لہذا اس کو بدلنا لازمی ٹھہرتا ہے ورنہ اسلام نئے زمانے سے ہم آہنگی پیدا نہ کر سکے گا۔

اس تمہید کے بعد اب آپ ان دو جملوں کو دوبارہ پڑھیے تو آپ کے لیے بات کھل کر واضح ہو جائے گی کہ زیر نظر کتاب اس احساس کے ساتھ لکھی گئی ہے کہ جدید زمانے کے لیے قدیم آلات، طریقے، طرز اور روایتی روشوں سے ہم قرآن و احادیث کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ اس سے حاصل شدہ دین کے احکام ہم سے

متعلق ہو سکتے ہیں لہذا ضروری ہے کہ اب جدید زمانے میں نئے طریقے فراہم کیے جائیں جن کی مدد سے قرآن و حدیث کو سمجھا جا سکے اور یہ کتاب اسی کوشش کا نام ہے۔

اسی لیے آپ رقمطراز ہیں:

"دین کو سمجھنے کی کم از کم دو صورتیں موجود ہیں:

الف) یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ دوسروں نے پہلے والوں نے، متقدمین نے کیا سمجھا؟

بد قسمتی سے مسلمانوں میں اس کی روایت زیادہ رہی ہے اور معتبر بھی۔

ب) خود سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے پہلے پہل تو گذشتہ مواد پر نظر ڈالی جائے گی کہ وہ کیا ہے اور یہ کہ ان حضرات کے نصوص دینی کو سمجھنے کے طریقے درست بھی تھے یا نہیں۔

دوسری اہم چیز یہ ہے کہ ان طریقوں سے اگر اطمینان اور مقصود حاصل نہ ہو تو دوسرے کیا طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں؟

اس کتاب میں زیادہ تر گفتگو اس دوسرے موضوع سے متعلق ہے۔" (ص45)

پس اس کتاب میں پہلے مجموعی و اجمالی طور پر ان طرق و اسالیب پر نظر ڈالی گئی ہے جو رائج تھے بعد ازاں اپنا طرزِ تفکر اور تفہیمِ نصوص کے اصول دیے گئے ہیں۔

اس اہم کتاب کے موضوع کو سمجھنے کے بعد اس میں موجود دس ابواب کا تعارف تو طوالت کا سبب ہو گا البتہ ہم چند ایک ابواب کا مرکزی نکتہ اور نچوڑ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

باب اول: تمہید

اس باب میں انہوں نے تین چیزوں پر بات کی ہے

اول: فقہاء کے اختلافات کے اسباب کیا تھے؟

دوم: صحابہ کا طرزِ استدلال اور ان کے اختلاف کی وجوہ کیا تھیں

سوم: خلفائے راشدین کا طریقہِ استنباط

ان میں سے پہلے ذیلی عنوان (اختلاف فقہاء کے اسباب) میں دیگر علماء کے اقتباسات نقل کرتے ہیں جن میں کچھ نے آٹھ تو کسی نے چھ اور کسی نے دس تک اختلافات بیان کیے ہیں مگر ان سب اختلافات کا محور و مرکز کیا ہے؟ اور ان میں غلطی کیا ہے؟

اس پر ڈاکٹر محسن نقوی کا تبصرہ دیکھیے:

"ان مختصر سی گزارشات میں ایک اہم بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مواد یا نصوصِ شرعیہ کا مطالعہ بنیادی طور پر لغوی اعتبار ہی سے کیا گیا ہے اور عربی صرف و نحو، فصاحت و بلاغت کی اہم بحثیں اس ضمن میں اٹھائی گئی ہیں یعنی نصوصِ شریعہ کو معاشرے اور مقاصد سے بر طرف کر کے اسے لغت و لسان عرب کا اکھاڑا بنا دیا گیا۔" (ص15)

آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ ڈاکٹر محسن نقوی فقہاء کے اختلافات کو نہ صرف معاشرے کے تحت جا کر سمجھنے کے حامی ہیں بلکہ نصوصِ شریعہ کے متعلق بھی یہی بات شد و مد سے کہتے ہیں۔

آٹھویں باب میں لکھتے ہیں:

عربی نصوص کی تفہیم کے لیے یہ تین چیزیں ضروری ہیں:

اول: یہ سامنے رکھنا کہ عربی زبان صرفی واشتقاقی ہے

دوم: قرآن وحدیث کو بطور کلام پڑھنانہ کہ تحریر

سوم: ان نصوص کو حالات، مقام اور زمانے کی تکون میں رکھ کر دیکھنا۔(مفہومًا)

"یہ تینوں قیود ہمیں یہ بتائیں گی کہ جس وقت زیر مطالعہ مخصوص الفاظ استعمال کیے گئے نیز جس مقام پر انہیں ادا کیا گیا وہاں اس زمانے میں زبان اپنے ارتقاء کی کس منزل پر تھی؟" (ص157)

پس ڈاکٹر معاشرے کو فراموش کر کے محض نص تک محدود ہونے کو نہایت بڑی اور بنیادی غلطی تصور کرتے ہیں جس کی وجہ ان کی نگاہ میں یونانی طرز فکر کا آنا ہے البتہ دیگر اسباب بھی انہوں نے رقم کیے ہیں۔

یہاں تیسرے باب کا اقتباس لکھتے ہیں تا کہ یہ بات پایہ وضوح تک پہنچ جائے کہ آپ نصوص کو معاشرے سے منتھی کر کے دیکھنے کے کس درجہ حامی ہیں۔

سب سے پہلے بتاتے ہیں کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ دین اور اس کے احکام ہمیں دو ماخذ سے ملتے ہیں یعنی اس کے دو ہی ماخذ ہیں ایک قرآن تو دوسرا احدیث و سنت نبوی۔

اس تقسیم پر آپ کہتے ہیں:

"حالانکہ کسی بھی مذہب یا قانون کا ماخذ بنیادی طور پر معاشرہ ہوتا ہے۔" (ص45)

درج بالا اقتباس جہاں نصوص عربی کو سمجھنے کے تین معیار بیان ہوئے وہاں ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ قرآن و حدیث کلام ہیں تحریر نہیں۔

ہمارے خیال میں اس پر ذرا تفصیل سے لکھنا خالی از فائدہ نہیں۔

باب ہفتم میں ڈاکٹر سوال اٹھاتے ہیں کہ قرآن تحریر ہے یا کلام؟

آپ لکھتے ہیں کہ:

"قرآن مجید تحریر ہے یا کلام، ایک بہت ہی اہم اور بنیادی سوال ہے۔ قرآن مجید کی لسانی تفہیم میں اس کا تعین بہت ضروری ہے کیونکہ تحریر کی **زبان اور ابلاغ** اور اس کے بالمقابل تقریر یا کلام کی **زبان اور ابلاغ** کے اصول مختلف ہوتے ہیں۔" (ص146)

تھوڑا آگے چل کر لکھتے ہیں:

"قرآن مجید اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام ہے جو وحی کی صورت میں نبی کریم ص پر نازل ہوا بعد ازاں نبی کریم ص کے امر کے مطابق اسے تحریری شکل دی جاتی رہی۔ گویا ہمارے ہاتھوں میں جو کلام مقدس قرآن مجید کی صورت میں موجود ہے اس کے اجزا یہ ہیں:

۱۔ متکلم یعنی اللہ

۲۔ کلام

۳۔ طریقہ ابلاغ وحی یعنی اشارہ خفی

۴۔ مخاطب یعنی نبی کریم ص

۵۔ کلام یا خطاب کا تحریری شکل میں آنا۔

گویا اس کی تحریری شکل کی کیفیت و حیثیت یہ ہے کہ تقریر کو قلمبند کر لیا گیا ہے۔" (ص146)

تحریر و کلام کے فرق کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے سورہ نمل سے کیس اسٹڈی پیش کی ہے جس کا ہم یہاں ایک ہی جزء پیش کر رہے ہیں تا کہ مختصر اًمثال سے اصل مدعا واضح ہو سکے۔

مثال

ٱذْهَب بِّكِتَٰبِي هَٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَٱنظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ (سورہ نمل آیت28)

"یہاں متکلم کا نام وغیرہ محذوف ہے؛ کیونکہ گفتگو حضرت سلیمان کی ہے لہذا یہاں متکلم حضرت سلیمان کو ماننا پڑے گا۔ یہ اسلوب گفتگو میں استعمال ہوتا ہے۔ گویا یہاں (قال سلیمان = سلیمان نے کہا) محذوف ہے۔

"اذھب" گو کہ امر کا صیغہ ہے لیکن یہاں حکم اور ہدایت دونوں مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ مکالمے میں امر بطور ہدایت آتا ہے۔

اس آیت کا ترجمہ کلام مانتے ہوئے یوں ہو گا:

"تم ایسا کرو کہ میرا یہ خط لے کر جاؤ اور ان لوگوں تک پہنچا دو، پھر ان سے پلٹ کر مشاہدہ کرو کہ یہ کیا نتیجہ نکالتے ہیں۔"

اقتضائے کلام یہ ہے کہ تحریر کے لحاظ سے اس جملے کا ترجمہ یوں ہو:

"سلیمان نے حکم دیا: جاؤ میرا یہ خط لے جاؤ جو ان پر ڈال دینا اور پھر پلٹنا ان سے اور دیکھنا کہ وہ آپس میں کیا مشورہ کرتے ہیں۔" (ص151)

چوتھا باب

اس کے بعد چوتھے باب میں وہ تفصیل سے بتاتے ہیں کہ آخر وہ کیا وجوہات ہیں جن کی وجہ سے قرآن کا دائرہ تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا ہے اور وہ کیا دلائل ہیں جن کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن اپنے اندر تنگی نہیں بلکہ وسعت لیے ہوئے ہے۔

چوتھے باب میں کئی نکات بہت اہم ہیں اور سب سے طویل باب بھی یہی ہے مگر تحریر کے طویل ہو جانے کی وجہ سے بادل ناخواستہ نکات ترک کرنے پڑ رہے البتہ ایک نکتہ چھوڑنا کتاب اور مصنف سے ناانصافی ہو گی۔

آپ پہلا سبب لکھتے ہیں:

"ہمارے خیال میں صدر اول کے مسلمانوں سے بھی اور اس کے بعد بھی جو غلطی عام مسلمانوں اور خاص طور پر علمائے کرام سے ہوتی رہی ہے وہ یہ کہ قرآن مجید کو انہوں نے قانون کی کتاب سمجھ لیا اور پھر اسی حیثیت سے اسے اختیار کیا جبکہ قرآن مجید دراصل کتاب ہدایت کے طور پر اپنا تعارف کرواتا ہے۔"

(ص67)

یہاں آپ کے ذہنوں میں سوال ابھرے گا کہ آخر قرآن کو کتاب قانون ماننے سے کیا خرابی ہوتی اور کتاب ہدایت کہنے سے کیا ثمرات حاصل ہوتے ہیں؟

اس پر ڈاکٹر محسن نقوی آیات اور علامہ آلوسی کے اقتباس کے بعد اپنی رائے کو مکمل واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پتہ چلا قرآن مجید کتاب ہدایت ہے اور اس کا مقصد اچھے ظاہر اور اچھے باطن کے حامل افراد کو پیدا کرنا

جو ایک اچھا معاشرہ تشکیل دیں۔

کتاب ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ کلمات قانون اور قضایائے منطقیہ نہیں ہیں بلکہ ایک ایسی ہدایت پر مشتمل ہیں جو عدل و احسان کے حامل افراد اور معاشرے کی تشکیل کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔" (ص69)

اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کو کتاب ہدایت کے بجائے کتاب قانون ماننے کا مطلب اوپر بیان کیے گئے مقصد سے بالکل دوسری سمت سفر ہے۔ قانون کے نزدیک زنا جرم ہے، چوری جرم ہے۔ رجم یا کوڑے اسی طرح قطع ید اس کی سزا ہے، خواہ معاشرے میں ان سزاؤں کے نفاذ سے یہ مقصد پورا ہوتا ہو یا نہیں۔ قانون کو اس سے کوئی غرض نہیں، وہ جرم، مجرم اور اس کی سزا کو جانتا ہے، گویا یوں کہنا چاہیے کہ قانون کی نظر میں سزا مقصد ہوا کرتی ہے جبکہ ہدایت کی نظر میں سزا ایک مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہوا کرتی ہے اور وہ مقصد ہے جرم کا خاتمہ ہے نہ کہ مجرمین کا جو قانون کا مطلوب ہے۔" (ص69)

پانچواں باب اس پر ہے کہ حضرت علی ع کا طریقہ کار کیا تھا؟

باب چہارم و پنجم کا نچوڑ

ہم چوتھے اور پانچویں باب کا نچوڑ انہی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ نکلا کہ موجودہ دور میں تعلیمات اسلامی کو ایک بدلے ہوئے تناظر میں دیکھنا اور اس کی تشریح و تعبیر جدید تقاضوں کے مطابق کرنی پڑے گی۔ گزشتہ صدیوں میں نصوصِ شرعیہ کو

سمجھنے کے جو پیمانے وضع کیے گئے ہیں ان کی اب کوئی علمی و فکری بنیاد نہیں رہی یا پھر وہ بہت زیادہ کمزور ہو چکی ہے۔ قرآن و سنت کے بیانات کو نئے طریقوں، نئے انداز سے مطالعہ کرنا ہو گا، زمان و مکان و حالات کے تناظر میں دیکھنا ہو گا۔

تدریجِ نزول، ناسخ منسوخ، عہدِ صحابہ میں تطبیقِ نو کی مثالوں کو سامنے رکھنا ہو گا، اعمال و آثارِ صحابہ کو حجتِ قطعی نہ مان کر احکام میں وسعت پیدا کرنی ہو گی۔ احکامِ شریعت کی تعبیر میں اہل تشیع کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نیز دیگر آئمہ اہل بیت کے اصولوں پر چل کر قید کو وسعت میں بدلنا ہو گا اور ان سب پر حاوی ایک مقصد ہے اور وہ ہے:

بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور معاشرتی مسائل کا حل۔" (ص134)

یہاں اس نکتے کو ایڈریس کرنا بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر محسن نقوی احکام کے وضع کرنے کی بنیاد کیا دیتے ہیں؟

وہ کہتے ہیں کہ اسلام نے جو احکام دیے ہیں ان کی روح اور مقصدیت کو تلاشا جائے اور اس کو سامنے رکھ کر نئے احکام وضع کیے جائیں:

"ان مقاصد کا تعلق معاشرے کی اصلاح و بہبود یا خیر ہے اور اسی کے لیے شریعت نازل ہوتی ہے۔

اس خیر کے حصول کے لیے **الفاظ نصوص** کے بجائے **روح نصوص** کو سمجھنا پڑے گا۔" (ص224)

اس کے بعد اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے کہ آخر مقاصدِ شریعت سے ڈاکٹر کی مراد کیا ہے؟

کیونکہ انہی مقاصد کے ارد گرد تمام احکام دائر ہیں تو ان کا تعین بہت ضروری ہے۔

آپ کل چھ مقاصد لکھتے ہیں:

"دین، نفس (جان)، عقل، نسل، مال اقر خیر مجتمع انسانی۔" (ص226)

اختتام

ہم اس تعارف کے اختتام پر دو باتیں کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

اول یہ کہ اس کتاب میں محض دعوے اور ادعا نہیں بلکہ با قاعدہ استدلال و دلائل ہیں اور نئے طریقے اور ان کی بنیاد بھی فراہم کرنے کی مکمل سعی کی گئی ہے۔

دوم یہ کہ اس میں کیس اسٹڈیز بھی پیش کی گئی ہیں جس سے پرانے طریقوں کو مد نظر رکھ کر بھی نص کو سمجھنے کی تطبیق کی گئی ہے اور بعد ازاں نئے طریقوں کا اطلاق کر کے مختلف نتائج بھی بر آمد کیے گئے ہیں جو کہ نہایت عمدہ روش ہے؛ کیونکہ اس طرح ان کے نئے طریقوں کی عملی مثالیں ہاتھ لگ جاتی ہیں۔

نوٹ: ہمارا مقصود محض تعارف تھا جو اتفاق و اختلاف سے قطع نظر لکھا گیا ہے۔

والسلام

نجف اشرف

24اپریل2025

جمعرات